

## واجد علی شاہ بحیثیت مثنوی نگار: ”حزنِ اختر“ کے حوالے سے

### Wajid Ali Shah as a Masnavi Poet: With Reference Masnawi *Huzn-e-Akhtar*

By Muhammad Iqbal, Student for Masters, Dept. of Urdu, Aliah  
University, Kolkata, India

#### Abstracts

Urdu literature comprises various genres, one of which is Habsiyati Adab (prison literature). A remarkable example of this is Wajid Ali Shah's masnavi *Huzn-e-Akhtar*, written in 1859 and published in 1860 in Calcutta. In this poetic work, he narrates the days of his imprisonment at Fort William. The masnavi describes the annexation of his kingdom, after which he sets out on a journey to London to seek justice. However, upon reaching Calcutta, he falls ill and, as a result, sends his mother, son, and brother ahead to London while he stays in Mochi Khola, Calcutta. Just as he begins to recover, the Revolt of 1857 breaks out, throwing the region into turmoil. In response, the British authorities imprison him at Fort William.

In *Huzn-e-Akhtar*, Wajid Ali Shah Akhtar not only mentions his family members and household staff but also reflects on the passing of his mother, brother, and child.

In terms of language and style, the masnavi is characterized by clarity, elegance, fluency, and eloquence. It reflects the charm of the Lucknavi dialect, especially *Begamati Zaban* (the refined speech of noblewomen), along with literary

embellishments. The smooth flow, spontaneity, and careful use of idioms and expressions make its tone highly engaging. The portrayal of events, emotions, and personal experiences is strikingly vivid, though its spelling differs significantly from modern conventions.

Overall, *Huzn-e-Akhtar* is an autobiographical, historical, prison-themed, and poetic travelogue. Through this work, Wajid Ali Shah expresses the sorrow and hardships he endured during this difficult period of his life.

**Keywords:** Habsiyati Adab, Huzn e Akhtar, Fort William, Annexation, Justice, Mochi Khola, Calcutta, Revolt of 1857, Imprison, Lucknavi Dialect, Begamati Zaban, Spelling, Autobiographical, Historical, Poetic Travelogue.

اُردو زبان نے ایسے ایسے جواہر پارے اردو ادب میں شامل کیے ہیں جو نگینے کے مانند ہیں۔ مثلاً قصیدہ، مثنوی، نظم، مرثیہ، رباعی، دانتان، ناول، افسانہ وغیرہ ان میں سے مثنوی نے اپنی عظمت و وقار دنیا سے تسلیم کروائی۔ اس صنف نے سحر انگیز مثنوی نگاروں کو شہرت عام اور بقائے دوام عطا کیا جن میں نصرتی، ملا و جہی، ابن نشاٹی، میر حسن، پنڈت دیا شکر نسیم کے علاوہ واجد علی شاہ اختر بھی شامل ہیں۔ یوں تو واجد علی شاہ اختر نے متعدد مثنویاں لکھی ہیں جن میں افسانہ عشق، دریائے عشق، بحر الفت، بہت حیدری، عشق نامہ، حزن اختر، بحر مختلف، نبات القلوب، لیکن حزن اختر شاہ کار مثنوی ہے۔ حزن اختر ایک سوانحی مثنوی ہے جس میں انھوں نے قید و بند کی صعوبتوں کا حال بیان کیا ہے۔

۱۷۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک ناگزیر باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہی سال ہے جب پلاسی کی جنگ لڑی گئی۔ اس کے بعد ہندوستان پر برطانوی حکومت نے سر اٹھانا شروع کیا اور دیمک کی طرح دھیرے دھیرے پورے ہندوستان کو چاٹنے لگی۔ ہندوستان پر حکومت کرنا اور اسے لوٹنا اس کی پالیسی میں صاف جھلکتا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان نے برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کا روپ اختیار کر لیا۔

مئی ۱۸۴۲ء میں یہ اعلان عام ہوا کہ واجد علی شاہ اختر آب اودھ کے ولی عہد کے فرائض سرانجام دیں گے اور ۱۸۴۷ء سے وہ اس ذمے داری کو سنبھالنے کے اہل ہو گئے۔ ولی عہدی کے زمانے سے ہی طوائفوں کے کوٹھے

پر جانار قص و موسیقی اور عیش و عشرت ان کے خمیر میں شامل رہا، یہی سبب ہے کہ تخت نشینی کے بعد بھی وہ ان سب چیزوں سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ ان ہی واقعات کو انگریزوں نے ڈھال بنا کر انہیں تخت سے علیحدہ کر دیا۔ عبدالکلیم شرر فرماتے ہیں کہ واجد علی شاہ متقی و پرہیزگار اور پابند شرع تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

عہد شاہی کے واجد علی شاہ کو میں نہیں جانتا۔ مٹیارج کے واجد علی شاہ کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ تو اتقا و پرہیزگاری خدا ترسی اور خدا پرستی کی مجسم تصویر تھے۔ مہ جبین اور ناز آفرین دلربائیں جو ان کی محل سرا میں تھیں، عقد متعہ کے ذریعے سے ان پر حلال کر لی گئیں تھیں۔

اس کے علاوہ واجد علی شاہ اپنی مثنوی نہایت حیدری، میں اس طرح رقم طراز ہیں:

ہوئے مجھ سے کب ترک صوم و صلوة  
میں ہر سال دیتا ہوں خمس و زکوٰۃ

علاوہ ازیں واجد علی شاہ اختر شروعات سے ہی فوجی سرگرمیوں میں جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے، وہ ایک ایسی فوج کی تشکیل کرنا چاہتے تھے جو وطن پر مصیبت کے وقت سراپا ڈھال بنے اور ہر طرح سے دشمنوں کا جم کر مقابلہ کرے۔ اس کے لیے وہ خود بھی وردی پہن کر پریڈ کرواتے۔ فوج کے لیے متعدد پلٹینیں بنائیں اور توپ خانہ بنایا تاکہ وہ کسی طرح سے کمزور نہ رہیں۔ یہ سب دیکھ انگریز خائف ہو گئے اور گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے ریڈیٹنٹ جنرل اوٹرم کے ہاتھوں خط بھجوا کر ۱۸۵۶ء میں سلطنت کو ضبط کر لیا اور بادشاہ کو معزول کر دیا اور کہا کہ ایک لاکھ روپیہ ماہانہ دیا جائے گا۔ واجد علی شاہ اختر نے یہ بیان لکھا ہے:

جو وہ لاٹ دلہوزی اس وقت تھے  
رعایا بہت تمسی [تم سے] ناراض ہی [ہے]  
رعایا نہ یکہینے [نہ دیکھیں گے] ہرگز تباہ  
مہینا ہر اک ماہ اک لاکھ [لاکھ] کا  
ریڈیٹنٹ جرنیل اوٹرم جو تھی [تھی]

واجد علی شاہ نے اس فیصلے کی عذر داری کے لیے لندن جانے کا تہیہ کیا جس کے لیے وہ کلکتہ روانہ ہوئے مگر طبیعت نے اجازت نہ دی جس کے سبب وہ کلکتہ میں مقیم رہے اور اپنی والدہ، بھائی اور بیٹے کو لندن کے لیے روانہ کیا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت نے انگریزوں کے دلوں میں دہشت کا سماں باندھ دیا جس کی وجہ سے واجد علی شاہ اختر کو قید کر کے فورٹ ولیم میں ۳۳ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ سے ۷ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۵ جون ۱۸۵۷ء سے ۱۹ جولائی ۱۸۵۹ء تک نظر بند کر دیا۔ جس کی روداد موصوف نے اپنی مثنوی 'حزنِ اختر' میں بیان کی ہے۔

مثنوی 'حزنِ اختر' کا سنہ تصنیف ۱۸۵۹ء ہے جسے ایک سال بعد ۱۸۶۰ء میں کلکتہ سے شائع کیا گیا۔ مثنوی 'حزنِ اختر' کا آغاز روایتی طریقے سے حمد، نعت اور منقبت کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس کے بعد کرل کو نیا کی مدح سرائی کی گئی ہے چون کہ وہ واجد علی شاہ اختر سے شفقت سے پیش آرہے تھے، یہی سبب ہے کہ اسیری میں بھی واجد علی شاہ انگریزوں کے خلاف غیض و غضب کرنے کے بجائے ان الفاظ کا استعمال کرتے ہیں:

خدا رکھی [رکھے] ذات اُس فلک قدر کے [کی]

بڑی عمر و دولت ہی [ہے] اس بدر کے [کی]

بعد ازاں تمہید میں وہ اپنی آپ بیتی شروع کرتے ہیں اور پہلے ہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ سارا ماجرہ صد فیصد سچ ہے جس میں کسی طرح کی تشکیک نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وہ قصہ سنا جو سراسر ہو سچ نہ اپنی طرف ہو نہ غیر و بچی [غیروں کی] سچ

وہ قصہ سنا جو کواہی [گواہی] رہی [رہے] فخری مین [میں] ہی [بھی] بادشاہی رہی [رہے]

وہ قصہ سنا جو بہت ٹھہیک [ٹھیک] ہو ذرا ہی [بھی] نہ پھر او سمین [اُس میں] تشکیک ہو

انتزاعِ سلطنت کا حال پڑ ملال لہجے میں بیان کرتے ہیں اور لکھنؤ سے کانپور، الہ آباد اور بنارس ہوتے ہوئے براہِ دریا شہر نشاۃ کلکتہ کے موچی کھولا یعنی مٹیا برج پہنچتے ہیں۔ یہاں طبیعتِ علیل ہونے کی صورت میں مزید سفر کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اپنی والدہ ملکہ کشور، بھائی مرزا سکندر حشمت جنرل صاحب بہادر اور ولی عہد مرزا محمد علی بہادر کو انگلستان کے سفر پر روانہ کرتے ہیں۔

بیماری سے شفا یابی کے بعد غسل کرنے کی خوشی محل میں منائی گئی لیکن یہ خوشی عارضی تھی کیوں کہ آسمان سے ٹپکے کھجور میں اٹکے والی بات تھی انگریزوں نے چاروں طرف سے قلعے کو گھیر لیا اور جان عالم کو فورٹ ولیم میں قید کر لیا گیا اور قصور یہ بتلایا کہ باغیوں کے بیان سے آپ پر مفصودوں میں شامل ہونے کا امکان ہے اس لیے آپ کو نظر بند کیا جاتا ہے۔ اس موڑ پر بادشاہ اور سکریٹری کے مابین گفتگو ڈرامائی رخ اختیار کر لیتی ہے جس سے بادشاہ کے حالات، جذبات اور احساسات کے مناظر آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

ایک عام انسان اپنی دہائی لگا رہا ہے۔

مفصل تو بتلائی [بتلائی] اسکا حال  
مجھی [مجھی] رنج ہی [ہے] اس سخن سی [سے] کمال  
کہ مجہہ [مجھ] سی [سے] الہی ہوئی [ہوئی] کیا خطا  
ہوئی [ہوئے] لاٹ صاحب جو مجہپر [مجھ] پر خفا  
انہوں [انہوں] نی [نے] کہا اتنا معلوم ہی [ہے]  
کہ غیرونی [غیروں کی] شرکت کی کچہہ [کچھ] دہوم [دھوم] ہی [ہے]  
مین [میں] کہانی [کھانے] لگا [لگا] روکی [روکے] قسیمین [قسیمیں] شدید  
کہ یہہ [یہ] افترا وہم سی [سے] ہی [ہے] بعید

مذکورہ اشعار کے علاوہ مثنوی میں جگہ جگہ یہ رنگ دیکھنے کو ملتا ہے جب کہ قید و بند کی صعوبت سے قبل کی  
تحریر دیکھتے ہیں تو ایسا نظر نہیں آتا ہے مثلاً 'عشق نامہ' کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

خوشی کے سوا کام آتا نہ تھا  
کبھی رنج کا نام آتا نہ تھا

بہر کیف واجد علی شاہ اختر فورٹ ولیم میں ۲۴ مہینے قید میں رہے اور ان کے ساتھ کل تینتیس لوگ گئے جن میں سے  
آہستہ آہستہ سب باہر آتے گئے اور کچھ کا انتقال وہیں قید میں ہوا جن میں سے ایک نام فتح الدوہ برق کا ہے۔ اُن کی  
وفات پر اختر بہت رنجیدہ ہوئے۔ برق ہمیشہ سے ہی اختر کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آتے اور ضعیفی میں بھی  
ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور آخر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اختر اُن کے حوالے سے رقم کرتے ہیں:

ہوئی [ہوئے] سن چوہتر مین [میں] یہہ واردات  
دہن سی [سے] نہ نگلی مری ایک بات  
کیا صبر مینی [میں] نے کلجے کو تھام  
جو تپ نی [نے] کیا کام اُنکا [اُن] تمام

برق کی وفات کے بعد اختر نے اپنی والدہ، بھائی، بھتیجی اور دوسرے بہت سے لوگوں کی وفات کا غم مناتے  
ہوئے انسانی جذبات کی بہترین عکاسی کی ہے۔ اختر نے دن تاریخ اور مد فون سب کا ذکر تفصیل سے کیا ہے جسے

پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نوحہ لکھا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں:

کہ اکد دفعتاً [اک دفعتاً] آیا لندن سی [سے] خط  
لکھا [لکھا] غم کا مضمون تھا [تھا] اس نمط  
مقدم رجب پر جو ہوتا ہی [ہے] ماہ  
ہوا اُس میں [اُس میں] یہہ [یہہ] واقعہ آہ آہ  
مری والدہ تھیں [تھیں] جو عفت مآب  
وہ جنت کو راہی ہوئی ہیں [ہیں] شباب  
رہا سوی [سوئے] ملک بقا جمگھٹنا [جمگھٹنا]  
وہ مان [ماں] بیٹی [بیٹی] مدفون ہوئی [ہوئی] ایک [ایک] جا  
ہوئی [ہوئی] دفن دونوں [دونوں] بہ ملک فرانس  
اوہر [اُدھر] ہو گیا میری [میرے] دل کو ہراس

اس مثنوی میں واجد علی شاہ نے اپنے اہل و عیال کو یاد کیا ہے اور اُن کا احوال بھی مختصراً بیان کیا ہے۔ اپنے بیٹے اور بیٹیوں کی تعداد بھی لکھتے ہیں۔ ان کے ۸ شہزادے اور ۵ شہزادیاں تھیں۔ اس کے علاوہ اختر نے اپنے یہاں کام کرنے والے ملازموں کا تذکرہ کر کے انھیں زندہ جاوید کر دیا۔ تاریخ کے اوراق جب پلٹیں جائیں گے تو ان کے نام ضرور آئیں گے اور یہی اس بات کا مین ثبوت ہے کہ واجد علی شاہ ایک انسان دوست شخصیت کے مالک تھے۔ پوشاک دوز محمدی خانم، کھار قادر بخش، گاڑی پونچھ امام خان، پھوپھا کا مصاحب مجاہد الدولہ، کھانا پکانے والا راحت سلطان، پان کھلانے والا بی حسینی، پانی پلانے کے لیے کربلائی، چیرا سی جمال الدین، حقہ اٹھانے والے شیخ امام، گولہ انداز محمد شیر خان، چوہدر اباقر محمد، سقہ کریم بخش وغیرہ وغیرہ کا ذکر بلا جھجک واجد علی شاہ نے مثنوی میں کیا ہے۔ واجد علی شاہ کو موسیقی سے قلبی لگاؤ تھا جس کا اظہار انھوں نے اس مثنوی میں بھی کیا ہے۔ مثلاً سارنگی، رود، سرود، طنبوری، چکارا، کنار، دچنگ، پھکاوج، سر سنکھار، ستارا، نرتال، ہڑک، جھانچھ، منجیرے، درتار، مرچنگ، تماشہ، ترم پٹ، تونیا، بل ترنگ وغیرہ۔

مثنوی کی ابتدا احمد سے اور انتہا مناجات پر ہوتی ہے۔ مناجات میں واجد علی شاہ اختر الہی سے قید سے رہا کرنے کی التجا کر رہے ہیں۔ جس کے لیے وہ قیام بھی دے رہے ہیں تاکہ کسی بھی صورت میں رہائی نصیب ہو۔ اختراوں

گویا ہوتے ہیں۔

خدایا محمدؐ تقی کی [کے] لئے [لیے] خدا یا علیؑ التقی کی [کے] لئے [لیے]  
حسنِ عسکری کی [کے] لی [لیے] ایچدا [اے خدا] اس اختر کو کر قیدِ غم سی [سے] رہا [رہا]ؑ  
واجد علی شاہ اختر ایک محب وطن تھے ان کی رگوں میں وطن سے محبت کا لہو دوڑ رہا تھا۔ اسیری میں بھی وطن  
سے اخوت و محبت جھلکتی ہے وہ اس مثنوی کا اختتام ان اشعار سے کرتے ہیں جن سے وطن کی خیر خواہی کا جذبہ  
جھلکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

آہی [اہی] رہیں شاد یارانِ ہند پھر آباد ہووین [ہوویں] جو انانِ ہند  
ہوئی [ہوئی] مثنوی اس سخن پر تمام سلامؑ علیکم علیک السلامؑ  
مثنوی 'حزنِ اختر' تاریخی، سوانحی، نیم خودنوشت کے علاوہ حبسیاتی ادب کا بھی ایک نادر نمونہ ہے۔ اس  
مثنوی میں کل ۷۸ عنوانات سارے فارسی میں اور ۱۲۳۹ اشعار اردو میں قلم بند کیے گئے ہیں۔ مثنوی کا قصہ واجد علی  
شاہ کے گرد گھومتا ہے جس میں ان کے مصائب و المنائی کا ذکر ہے۔ لکھنؤ سے نکلنا، کلکتہ میں مقیم ہونا، قلبی رشتوں  
کا انتقال اور جدا ہونا، بیگمات سے دوری، ہجر و فرقت سب کچھ کا بیان ملتا ہے۔ اس میں واقعے کی حقیقت اور صداقت  
کا پاس رکھا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کا ہی واقعہ لیجیے جس میں غدر شروع ہونے کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

سبب اسکا [اس کا] ہمنی [ہم نے] تو تھا [تھا] یہہ [یہ] سنا  
کہ کچہ [کچہ] کار تو سونپ [سونپا] قصہ ہوا  
کہون [کہوں] کیا میں [میں] ان روزوں [روزوں] تھا [تھا] جو علی  
شفا کی نکلتی نہتی [نہ تھی] کچہ [کچہ] سبیلؑ

کسی کسی جگہ تاریخوں کے باعث مثنوی کے بیانات مبہم اور مشکوک بن جاتے ہیں۔ کہیں دن کا ذکر ہے تو مہینے کا  
نہیں اور مہینا ہے تو دن کا نہیں۔ مثلاً غسلِ صحت کے دوسرے دن قید ہوئے جس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

تہتر تہی [تھے] سن بارہ سو پر رقم  
ہوئی [ہوئے] داخل قید خانہ جو ہمؑ

اس مثنوی میں جو املا لکھا گیا ہے وہ موجودہ املا سے یکسر مختلف ہے۔ کہیں یائے مجہول کی جگہ یائے معروف لکھا گیا  
مثلاً 'مجھے' کی جگہ 'مجھی'، 'ہ' کے لیے 'ہ' جیسے 'لکھی'، 'گ' کے بجائے 'ک' جیسے 'کہہرا' وغیرہ اور اس کے ٹھیک

برعکس بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نون غنہ کے بجائے نون کا استعمال ہوا ہے مثال کے طور پر 'میں' کی جگہ 'میں' اور لفظوں کو جوڑ کر بھی لکھا گیا ہے جیسے 'رُخ میں' کو 'رُخ میں' وغیرہ۔

جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے اس میں صفائی، دلکشی، سلاست و فصاحت، سادہ و سلیس لکھنوی خصوصاً بیگماتی زبان اور صنعتوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ روانی و برجستگی اور اصطلاحات و محاورات کا بھی خیال رکھا گیا ہے جس کے باعث اس کالب و لہجہ متاثر کن ہو گیا ہے۔ کسی بھی واقعات، احساسات و جذبات کا انکشاف غیر معمولی طور پر کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے جمیل جالبی اپنی کتاب تاریخ ادب اردو جلد سوم میں فرماتے ہیں:

اس مثنوی کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اختر کو زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔  
نثر کی طرح وہ نظم بھی تیزی سے لکھ سکتے تھے۔ ان کے ہاں روانی و برجستگی ہے، زبان صاف  
اور شستہ ہے۔ جذبات کے اظہار اور مختلف واقعات کو بیان کرنے کی غیر معمولی قوت ہے  
اور اسی لیے اثر و تاثیر اس مثنوی کی عام خصوصیت ہے۔<sup>۵</sup>

تشبیہ و استعارہ کی مثال ان اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جن میں وہ اپنی محبوبہ کا ذکر چھیڑتے ہیں:

سَرِ نوکِ خامہ چٹنگ [چٹک] رُخ سی [سے] نکل مارِ قارون [اں] ذرا گنج سی [سے]  
چپک بلبل لکھنو باغ میں [سے] ہما میں دکھا فرق اور زاغ میں [میں] ک  
صاف گوئی اور برجستگی کی مثال ملاحظہ کیجیے:

مگر مجھ پہ [مجھ] پہا گدرا جو کچھ [کچھ] وہ سنو  
جو بی [بھی] ربط ہووی [ہووی] تو اصلاح ہو  
مگر یا وہ گوئی نہیں [اں] میرا کام  
بہرا [بھرا] استعاروئی [اں] سے ہی یہہ [یہہ] کلام  
پی [پے] رنگ کچھہ کچھہ [کچھہ] جو دی ہی [ہے] بھار [بھار]  
وہی داخل شاعری ای [اے] نگار

مثنوی 'حزنِ اختر' کا اردو مثنوی میں اپنا ایک علیحدہ مقام ہے۔ یوں تو مثنوی بہت سی لکھی گئی ہیں اور ہر نوعیت کی ہیں، جب عشقیہ مثنوی کا زور تھا تب واجد علی شاہ اختر نے حزنیہ سوانحی مثنوی لکھی۔ سوانحی مثنوی بہتوں نے لکھی ہیں جن میں میر کا نام سرفہرست ہے مگر میر اور اختر کی مثنوی میں فرق ہے۔ واجد علی شاہ کی مثنوی ایک

زندانی کی کہانی ہے جس میں صداقت، اسیری کا غم اور آزرده طبیعت اپنا پرچم بلند کیے نظر آتی ہے۔ جب کہ میر کے یہاں اس کا رنگ مدہم نظر آتا ہے وہ اپنی دنیا میں مست چرند و پرند، گھر کے حالات اور عشق کی چوٹ کو اپنا موضوع سخن بناتے ہیں۔ جب کہ کچھ ناقدین ادب مثنوی 'حزنِ اختر' کو منظوم سفر نامہ کی حیثیت سے بھی تسلیم کرتے ہیں، علاوہ ازیں زبان و بیان کی ندرت، سوانحی و حبسیاتی ادب اور تاریخی اہمیت کے لحاظ سے اس مثنوی کا مقام منفرد ہے۔ واجد علی شاہ کی اس مثنوی کی اہمیت اس وقت دوبالا ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اختر نے اس مثنوی میں کسی سے اصلاح لیے بغیر خود کا کلام تحریر کیا ہے جتنے بھی الفاظ ہیں وہ ان کے خود کے ہیں۔ اس حوالے سے عبد الکلیم شرر نے بجا فرمایا ہے:

ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ واجد علی شاہ کا کلام برا بھلا جو کچھ بھی ہے خاص اُن کا ہے  
اس میں ایک حرف بھی کسی اور کا نہیں۔<sup>۱۵</sup>

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مثنوی 'حزنِ اختر' واجد علی شاہ کی آپ بیتی ہے جس کے ذریعے اُنہوں نے اپنی آزرده حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ معزولی، جلا وطنی، علالت اور اسیری جیسے حالات میں بھی وہ اپنے گھر والوں، رفقا اور خدمت گاروں کو نہیں بھولتے۔ غرض اختر کی اس مثنوی کو محض شعری کلام کہنا نا انصافی ہوگی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کی ادبی، سوانحی، تاریخی اور حبسیاتی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

## حواشی

- ۱۔ عبد الکلیم شرر، مقدمہ، مشمولہ مثنوی حزنِ اختر، (لکھنؤ: نول کٹور، ۱۹۲۲ء)، ص ۱۰۱۱۔
- ۲۔ سلمی محمد رفیق، حزنِ اختر (مثنوی واجد علی شاہ اختر)، (نئی دہلی: ناشر مصنفہ، ۲۰۱۳ء)، ص: ۲۳۔
- ۳۔ ایضاً، ص: ۱۳۰۔
- ۴۔ ایضاً، ص: ۱۲۶۔
- ۵۔ ایضاً، ص: ۱۲۹۔
- ۶۔ ایضاً، ص: ۱۳۷۔
- ۷۔ ایضاً، ص: ۱۰۵۔
- ۸۔ ایضاً، ص: ۱۳۷۔
- ۹۔ ایضاً، ص: ۱۵۶۔

- ۱۰۔ ایضاً، ص: ۲۰۷  
۱۱۔ ایضاً، ص: ۲۰۸  
۱۲۔ ایضاً، ص: ۱۳۵  
۱۳۔ ایضاً، ص: ۱۳۶  
۱۴۔ ایضاً، ص: ۱۴۳  
۱۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، (دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۲۱ء)، ص: ۹۸۰  
۱۶۔ سلمیٰ محمد رفیق، حزن اختر (مثنوی واجد علی شاہ اختر)، ص: ۱۸۷  
۱۷۔ ایضاً، ص: ۱۷۶  
۱۸۔ عبدالحکیم شرر، مقدمہ، مشمولہ مثنوی حزن اختر، ص: ۱۵

## ماخذ

- ۱۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۲۱ء  
۲۔ رفیق، سلمیٰ محمد، حزن اختر (مثنوی واجد علی شاہ اختر)، نئی دہلی: ناشر مصنفہ، ۲۰۱۳ء  
۳۔ شرر، عبدالحکیم، مقدمہ، مشمولہ مثنوی حزن اختر، لکھنؤ: نول کشور، ۱۹۲۲ء

## Bibliography:

1. Jalibi, Jameel, Dr., *Tareekh-e-Adab-e-Urdu*, Vol. 3, Delhi: Educational Publishing House, 2021
2. Rafiq, Salma Muhammad, *Huzn-e-Akhtar (Masnavi Wajid Ali Shah Akhtar)*, New Delhi, published by author, 2013
3. Sharar, Abdul Haleem, *Foreward in Masnavi Huzn-e-Akhtar*, Lucknow: Nawalkishore, 1922.